© rasailojaraid.com

۱٦- **تصوف اسلام** ، عبدالماجد دریا بادی -
۱٦- **تصوف اسلام** ، دکتر غنی -
۱۸- **ثمرات القدس** ، مرزا لعل بیگ لعلی نسخہ کتابخانہ راہپور ، ۸۳ -
۱۹- **خزینۃ الاولیا** ، (دو جلد) منشی غلام سرور لاہوری - لاہور ، ۱۲۸۴ -
۲۰- **سبک شناسی** ، (۳ جلد) ملک الشعراء بہار - تہران ، ۱۳۴۰ -
۲۱- **سفینۃ الاولیاء** ، داراشکوہ - لکھنئو ، ۱۸۷۲ -
۲۲- **شرح نفحات الانس** ، شیخ حامد کشمیری -
۲۳- **قاموس الاعلام** ، شمس الدین سامی بیگ - استانبول، ۱۳۱٦ - ۱۳۰۲ -
۲۴- **کشف الظنون** ، حاجی خلیفہ - قاہرہ ، ۱۹۴۱ -
۲۵- **کشف المحجوب** ، نسخہ خطی متعلق بکتابخانہ ، استاد دکتر محمد شفیع -
۲٦- **کشف المحجوب** ، لاہور ایڈیشن ، ۱۸۷۴ -
۲۷- **کشف المحجوب** ، سمرقند ایڈیشن ، ۱۹۱۲ء -
۲۸- **کشف المحجوب** ، متن تصحیح شدہ ویلینتائن ژوکوفسکی - تہران ، ۱۳۳٦ هجری قمری -
۲۹- **کشف المحجوب** ، نسخہ تہران ، ۱۹۷۸ م -
۳۰- **کشف المحجوب** ، نسخہ خطی لاہور (رک نوائے وقت لاہور ، ۹ دسمبر ۱۹۷۷ء)
۳۱- **ماثرالکرام** ، غلام علی آزاد بلگرامی - حیدرآباد ۱۹۱۰ -
۳۲- **مراۃ الجنان** ، عبد اللہ یافعی - حیدرآباد -
۳۳- **المنتظم فی تاریخ الامم** ، ابن الجوزی- قاہرہ -
۳۴- **وفیات الاعیان** ، (۲ جلد) ابن خلکان ، قاضی احمد بن محمد - تہران ، ۱۲۸۴ھ -

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

محمد منور*

قرآن کریم کی تعلیمی جہت اور علامہ اقبال

اللہ نور السموات و الارض[1] — اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے، اور اللہ وہی ہے جس نے "لا شے" سے ہر شے پیدا کردی، "بدیع السموات و الارض[2]" — جہاں کچھ نہ تھا وہاں سب کچھ ہو گیا، اور ہوتا چلا جارہا ہے۔ "یزید فی الخلق ما یشاء[3]" — وہ (خدا) خلق میں جس چیز کا چاہتا ہے اضافہ کرتا ہے۔ اولاً جو کچھ تھا وہ نور ہی نور تھا — پھر جو بنا نور ہی سے بنا۔ نور ہی منجمد ہوا، نور ہی نے دبازت اور کثافت اختیار کی، نور ہی نے ٹھوس وجود پایا، ٹھوس ہونے کا آغاز دھواں تھا، سائنس نے اس کیفیت کو لطیف اجزا پر مشتمل گیسوں کا مظہر[4] (Gaseou Mass with Fine Particles) بتایا ہے اور قرآن اسے "دخان" قرار دیتا ہے[5]۔

اشیاء تحلیل ہوں تو آخر کار دھواں رہ جائے، اور دھواں لطیف ہو کر پھر نور (Light) میں ڈھل جائے۔ جبھی تو علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اگر آدم سچ مچ دیکھنے والی آنکھ کا مالک ہو تو آنکھ کے سامنے کوئی شے حائل نہیں رہتی، شرط یہ ہے کہ کوئی دیکھے:

جہاں میں دانش و بینش کی ہے کس درجہ ارزانی
کوئی شے چھپ نہیں سکتی کہ یہ عالم ہے نورانی!
کوئی دیکھے تو ہے باریک فطرت کا حجاب اتنا!
نمایاں ہیں فرشتوں کے تبسم ہائے پنہانی!!

اسی کیفیت کو علامہ اقبال نے ایک اور مقام پر ان الفاظ میں واضح کیا ہے:

ہر چہ می بینی زسر انوار حق است!!
حکمت اشیا ز اسرار حق است!

---

* پروفیسر و صدر شعبۂ اقبالیات پنجاب یونیورسٹی۔

۱- قرآن حکیم ۳۵ : ۲۴ ۲- قرآن حکیم ۱۱۷ : ۲ ۳- قرآن حکیم ۱ : ۳۵

۴- The Bible, The Quran and Science By Mauric Bucaille (English) Indianapolis, I. N. USA, P 139.

۵- قرآن حکیم ۱۱ : ۴۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یعنی اشیاء کی حقیقت اسرار الٰہی سے آگاہی ہے اور سب اسرار سراسر انوار ہیں ۔ اسی لیے تو کہا گیا ''العلم نور''—آدم کو اللہ نے وہ نوری اہلیت عطا کی ہے کہ وہ کائنات کے اسرار سے آگاہ ہوسکے ۔ قرآن نے کئی بار واضح کیا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے آدم کے حضور میں جب فرشتوں کو سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا تو فرشتوں نے اس حکم پر حیرت زدہ ہوکر استفسار کیا کہ اے مولا ہم جو تیری عبادت اور تقدیس میں مصروف رہنے والی مخلوق موجود ہیں پھر آدم کو خلق کرنے کا مطلب ، اور آدم وہ مخلوق ہے (اپنے ضمیر کے باعث) جو جہان میں افراتفری ڈالے گا ، خون خرابہ کرے گا ، تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد کیا میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ، اور پھر فیصلہ ''علم اشیاء'' سے آگاہی پر ہوا ۔ یہ آگاہی فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارزانی نہیں ہوئی تھی ۔ آدم کو اللہ نے اس علم سے سرمایہ دار کر رکھا تھا ، مراد ہے آدم کے خمیر میں وہ جوہر اور وہ قابلیت اللہ نے شامل کر دی تھی جو اشیاء کی حقیقت تک رسائی حاصل کر سکے ، یہی آدم کی فضیلت تھی ، اسی فضیلت کے حضور میں فرشتوں کو سر ادب خم کرنا پڑا ۔ جبھی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرمایا کرتے تھے :

''الهم أرنی حقیقة الاشیاء کما هی''

(اے اللہ مجھے حقیقت اشیا اس طرح دکھا دے جس طرح کہ وہ واقعی ہے)

اور ظاہر ہے کہ یہ دعا اللہ کے انوار کو سرتاسر بے پردہ دیکھتے رہنے کی آرزوے بیتاب ہے ۔ قرآن کریم کی پہلی آیت جو حضور نبی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی ''اقرا بسم ربک الذی خلق'' [۱] (اے رسول ! آپ پڑھیں اُس رب کے نام سے جو خالق ہے) ۔

وہ خالق جو رب بھی ہے وہ جو خلق کرنے کے بعد پالتا بھی ہے تحفظ بھی عطا کرتا ہے ، اور وہ جو نہایت بلند ہے یعنی اس کتاب کو جو اسرار الٰہی کا خزینہ اور قدیم و جدید علوم کا امانت خانہ ہے ، اللہ کے نام سے پڑھنے کا حکم ہوا ۔ یہیں سے قرآنی تعلیم کی جہت طے ہوجاتی ہے ؛ یعنی علم کے جس بھی درجے ، جس بھی شعبے اور جس بھی حصے کو شروع کیا جائے اور جہاں سے بھی شروع کیا جائے اللہ ہی کے نام سے شروع کیا جائے ، اس لیے کہ وہی خالق ہے لہذا اسی کا علم کامل ترین ہے ''الا یعلم من خلق'' [۲] (کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا ؟) ۔ اللہ کے نام سے آغاز کرنے کا مطلب ہوا اللہ کی مطلق خلاقی کا اقرار و اعتراف ہی سرچشمۂ مخلوقات ہے ، روح کائنات ہے اس کے حوالے سے مطالعۂ اشیاء

۱- قرآن حکیم ۱ : ۹۶ ۲- قرآن حکیم ۱۴ : ۶۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کریں تو کائنات ایک بامعنی وحدت نظر آئے، ہر ذرہ دوسرے سے مربوط نظر آئے گا جس کا ایک مطلب یہ بھی ہوگا کہ آدم کو ہر لحظہ یہ احساس رہے گا کہ وہ خود بھی ایک حقیقت ہے اور حقیقۃ الحقائق کے ساتھ وابستہ و مربوط بھی ہے۔ اگر یہ ربط نہ رہے تو آدم ایک مہمل وجود ہو کر رہ جائے۔ حضرت غوث الاعظم فرماتے ہیں "کل من لا یعبد اللہ عزو جل من الذین لایدرون لم خلقوا"[۱] (ہر وہ شخص جو خدا کی عبودیت کا دم بھرے وہ ان میں سے ہے جن کو معلوم نہیں کہ وہ کیوں پیدا کیے گئے)۔ پروفیسر ایم عمر الدین نے امام غزالی کے فلسفۂ اخلاق پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

> Knowledge of God includes the knowledge of the creator and the creation comprising the universe, the soul, the circumstances attending after death and so on. And Knowledge of these things constitutes the knowledge of Islam. Thus it is all comprehending, for, every science is a religious science, if it promotes the realization of perfection. No science is bad in itself because every science is simply knowledge of the facts as they are, and this cannot be bad in itself.[۲]

مراد ہے ہر علم کا حصول دین کا حصہ تھا، اور یہ علم حیات ہی کے ہر شعبے سے متعلق نہ تھا حیات بعد الموت سے بھی مربوط تھا۔ چنانچہ علم حاصل کرنا اور علم کو عام کرنا ثواب اور سر بسر عبادت ہے، یہی باعث ہے کہ ہر پڑھا لکھا مسلمان دوسروں کو پڑھانا لکھانا اپنے لیے باعث رحمت جانتا تھا، وہ گھر میں بھی معلم ہوتا تھا اور باہر بھی، نور کا اکتساب اور نور کی تقسیم، کارخیر میں امداد باہمی ہے چنانچہ معلم کا مقام مسلم معاشرے میں بہت وقیع تھا۔ پہلی بار باتنخواہ اساتذہ بغداد کی نظامیہ یونیورسٹی میں مقرر کیے گئے۔ یہ یونیورسٹی پانچویں صدی ہجری میں نظام الملک طوسی نے قائم کی تھی۔ با تنخواہ اساتذہ کا تقرر مسلمان اہل علم کو سخت ناگوار گذرا، ڈاکٹر محمد اسد طلس لکھتے ہیں کہ ہمہ وقتی تنخواہ دار اساتذہ جب ملازم ہوئے تو علمائے خراسان نے ماتم علم کی مجلسیں منعقد کیں، اور کہا کہ معلمی:

"بلند نظر اور پاک نفس لوگوں کا شیوہ تھا، جن کے پیش نظر علم کے ذریعے فضیلت و کمال کا حصول ہوتا تھا، مگر اب جو علما آئیں گے وہ علم

۱- الفتح الربانی، المصطفی البابی، مصر (۱۹۶۸) ص ۶۱۵۔

۲- The Ethical Philosophy of Ghazali, Sh. M. Ashraf, Lahore (1977) ص ۱۱۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو محض کمائی کا ذریعہ بنائیں گے اور تنخواہ کے خیال سے دون نہاد اور نکمے افراد بھی اس جانب کا رخ کرنے لگیں گے"[1]

با تنخواہ اساتذہ کی تقرری حالات کی مجبوری تھی: علوم پھیلتے جا رہے تھے، تعلیم میں ضبط و نظم پیدا کرنے کی خاطر نظام الملک کو یہ اجتہاد کرنا پڑا۔ ہم اہل علم کے نزدیک تعلم و تعلیم کا جو تقدس تھا وہ بہر حال ان کے ماتمی ردعمل سے واضح ہو جاتا ہے۔

علامہ اقبال کے نزدیک مآخذ از روئے قرآن تین ہیں، مطالعۂ کائنات، مطالعۂ تاریخ (یعنی آثار ماضی) اور مطالعۂ نفس انسانی[2]، کائنات کے مطالعہ اور اس سے آگاہی کے مفہوم میں تسخیر کے معانی پوشیدہ ہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے:

"الم تروا ان اللہ سخر لکم ما فی السموات و ما فی الارض"[3]

(کیا تم لوگوں نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین میں جو جو کچھ ہے تمہارے لیے مسخر کر رکھا ہے)

مارس بکیل (Maurice Bucaille) لکھتا ہے کہ اگر یہ کتاب (مصنفہ ۱۹۷۷ء) میں نے تیس برس پہلے لکھی ہوتی تو میں قرآن کی آیات تسخیر کو کسی اور طرح دیکھتا، انہیں محض پیشگوئیاں سمجھتا، مگر اب تو دیگر سیاروں پر میزائل پھینکے جا رہے ہیں۔ انسان خلائی سفر کر رہے ہیں۔ آج وہ آیات تسخیر ایک مسلم حقیقت ہیں اور یہ وعدہ پورا ہو رہا ہے۔ اگر ہر آگاہی اللہ کے حوالے سے حاصل کی جائے تو پوری کائنات کا ربط باہمی زیادہ واضح طور پر سمجھ میں آ سکتا ہے۔ اگر خلاق العلیم پر ایمان ہو تو کائنات ایک وحدت ہے۔ ایک زندہ وجود نامی ہے، سائنس دان اپنی تحقیقات کی بنا پر اقرار کرتے ہیں کہ ساری کائنات باہم مربوط ہے مگر اہل ایمان سائنس دان جو کائنات کے ربط باہم کے سبب اور مصدر سے آگاہ ہیں ان کا کیف و سرور کچھ اور ہی قسم کا ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نے خوب کہا ہے:

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو!
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

قرآن نے آغاز اشیا کی حقیقت بتا دی تھی کہ دخان اور گیس سے شروع ہوئیں

۱۔ التربیۃ والتعلیم فی الاسلام، بیروت، ص ۱۲۶

۲۔ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ ترجمہ از سید نذیر نیازی، ص ۱۴۴

۳۔ قرآن حکیم ۲۰:۳۱

۴۔ The Bible, the Quran and Science.، ص ۱۲۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سائنس آج ثابت کر رہی ہے ۔ قرآن نے بتا دیا تھا کہ ہر ذی حس شے از نبات تا انسان (بشمول حیوان) ہمہ نوع پانی سے پیدا ہوئی ۔ سائنس آج وضاحت کر رہی ہے ، قرآن نے بتا دیا تھا کہ ہر ذی حس کے جوڑے پیدا کیے گئے حتیٰ کہ نباتات کے بھی ، سائنس نے آج اس حقیقت کو ثابت کیا ، قرآن نے بتا دیا تھا کہ تمام سیارگان اپنے اپنے مدار میں اللہ کے حکم سے گردش کرتے ہیں ۔ اپنے حلقے سے کوئی سیارہ بھی باہر نہیں نکل سکتا ، حتیٰ کہ سورج بھی اپنے کسی مستقر کی طرف روانہ ہے ، جدید سائنس نے تصدیق کی ، ہاں سورج کے باب میں اڑی رہی ، سائنس کا اصرار رہا کہ سورج گردش نہیں کر رہا مگر ۱۹۱۷ء شیپلے (Shapeley) نے ثابت کیا کہ کہکشاں اور سورج کو اپنا سفر مدار مکمل کرنے میں دو سو پچاس ملین سال لگتے ہیں ۔ اور سورج تخمیناً ایک سو پچاس میل فی سیکنڈ کے حساب رواں رہتا ہے ۔ مگر قرآن نے چودہ سو سال قبل واضح الفاظ میں یہ حقیقت بیان کر دی تھی[1] قرآن نے بیان کر رکھا ہے کہ اس کائنات میں اس دنیا جیسی اور بھی دنیائیں ہیں ۔ مارس بکیل لکھتا ہے کہ ابھی سائنس اس حقیقت تک رسائی حاصل نہیں کر سکی مگر آج بہت سے سائنس دان اس امکان کے قائل ہیں ۔ بہرحال میں نے ضروری جانا کہ اپنی کتاب میں قرآن کی بیان کردہ اس صداقت کو درج کر دوں جسے سائنس کبھی ثابت کر لے گی ۔[2]

مطلب یہ کہ سائنس آج قرآن کے حقائق مصرحہ تک پہنچ رہی ہے یا پہنچنے کی کوشش میں ہے وہ حقائق جو آج سے چودہ سو سال قبل نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی کتاب مبارک میں مندرج ہیں اور جو اس امر کا ثبوت ہیں کہ یہ کتاب انسانی تصنیف نہیں ۔ ذیل میں مارس بکیل کا ایک اقتباس جو قرآنی صداقت اور انجیل کے محرف ہونے پر دلالت کرتا ہے اصل انگریزی میں درج کیا جاتا ہے ۔ وہ لکھتا ہے :

> What initially strikes the reader confronted for the first time with a text of this kind is the sheer abundance of subjects discussed : the creation, astronomy, the explaination of certain matters concerning the earth, and the animal and vegetable kingdoms, human reproduction, whereas monumental errors are to be found in the Bible, I could not find a single error in the Quran. I had to stop and ask myself : if a man was the author of the Quran, how could he have written facts in the Seventh Century A.D. that today

---

۱- The Bible, The Qur'an and Science. ، ص ۱۶۱

۲- ایضاً ۱۲۲ ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

are shown to be in keeping with modern scientific knowledge. ?"¹

محولہ بالا کتاب کے مصنف نے انجیل کے محرف ہونے کا اقرار کیا ہے ۔ اس امر میں بھی قرآنی صراحت کی تصدیق کی ہے اور ثبوت اس امر کا یہی ہے کہ اگر انجیل میں تحریف نہ کی گئی ہوتی تو وہ سائنسی مسلمہ حقائق کے مخالف نہ ہوتی ، جو خدا قرآن میں صداقتیں ہی صداقتیں بیان کرتا ہے اس نے انجیل میں بھی صداقتیں ہی ارشاد کی تھیں ۔ قرآن کی سچائیاں دیکھ کر ماننا پڑتا ہے کہ انجیل کے ساتھ انسانی ہاتھوں نے چھیڑ چھاڑ کی ہے ۔ ہاں مارس بکیل نے کئی ایک مقامات پر اس امر پر زور دیا ہے کہ جہاں سائنس کی روشنی میں کوئی قرآنی آیت آج واضح نہیں اس کا مطلب ہے کہ ابھی سائنس وہاں تک نہیں پہنچی ۔

حق یہ ہے کہ آج اس سائنس کی روشنی کے دور ہی میں آیات ''متشابہات'' کا معنیٰ عیاں ہوتا ہے ۔ وہ آیات جن کا معنیٰ تا حال شرمندۂ وضاحت و صراحت نہیں ہوا ، مفسرین سلف کلمہ متشابہات کا مفہوم بھی شاید بخوبی سمجھنے پر قادر نہ تھے۔ بہرحال قرآن کو تا آخر الزمان ، انسان کا ساتھ دینا اور علمی و فکری رہبری کا حق ادا کرنا ہے ، اس لیے علامہ اقبال زور دیتے ہیں کہ قرآنی تلقین کے مطابق حقائق فطرت پر نظر غائر ڈالی جائے۔

''قرآن پاک کے نزدیک یہ شمس و قمر ، یہ سایوں کا امتداد ، یہ اختلاف لیل و نہار ، یہ رنگ اور زبان کا فرق اور یہ قوموں کی زندگی میں کامیابی اور ناکامی کے دنوں کی آمد و شد حاصل کلام یہ کہ یہ سارا عالم فطرت جیسا کہ بذریعۂ حواس ہمیں اس کا ادراک ہوتا ہے حقیقت مطلقہ کی آیات ہیں اور اس لیے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ان میں غور و تفکر سے کام لے ، یہ نہیں کہ بہروں اور اندھوں کی طرح ان سے اعراض کرے ، کیونکہ جو کوئی اس زندگی میں اندھوں کی طرح ان آیات سے اپنی آنکھیں بند رکھتا ہے وہ آگے چل کر بھی اندھا ہی رہے گا''²

یہاں ایک بات ضمناً عیاں ہو جاتی ہے کہ ہر وحی اپنے دور کی علمی اور فکری ترقی سے بہت برتر ہوتی ہے ، یہ وحی کا اعجاز ہے ۔ اعجاز کا لفظی معنی ہے عاجز کر دینا ، اور وحی کا چیلنج اور اسی طرح معجزے کا چیلنج متعلقہ علم و فکر یا کمال کے ماہرین کے لیے ہوتا ہے ، مثلاً حضرت عیسیٰ کا یہ اعجاز کہ وہ کوڑھیوں

۱۔ ایضاً ص ۱۲۰

۲۔ تشکیل جدید ص ۱۹۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو ہاتھ لگائیں اور وہ صحت یاب ہو جائیں یا وہ اندھوں کی آنکھوں پر ہاتھ پھیریں اور وہ بینا ہو جائیں یا وہ قبر پر کھڑے ہو کر کہیں ''قم باذن اللہ'' : اللہ کے حکم سے اٹھ کھڑے ہو ۔ یہ بات عوام کے قائل کرنے کی نہیں ، عوام سحر اور اعجاز میں فرق نہیں کر سکتے ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزے کو ان کے معاصر اہل علم اور خصوصاً اہل طب ہی سمجھ سکتے تھے ، وہی جانتے تھے کہ علم طب کہاں ختم ہوتا ہے اور معجزہ کہاں سے شروع ہوتا ہے ، چنانچہ اہل فکر و نظر کا ایمان سوچا سمجھا ایمان ہوتا ہے ، اور پھر ان کی مثال عوام پر اثر انداز ہوتی ہے ورنہ عوام از خود مداری ، ساحر اور صاحب اعجاز میں تفریق روا نہیں رکھ سکتے ، ہو سکتا ہے انھیں مداری کا مداری پن ، کراست و معجزہ سے زیادہ متاثر کر لے ۔

قرآن کریم نے اس باب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جادوگروں کے مابین رونما ہونے والے مقابلے کا ذکر کر کے مسئلے کو بڑی اچھی طرح واضح کر دیا ہے —— فرعون کا دربار اہل علم اور عوام کے نمایندوں سے بھرا ہوا تھا —— جادوگروں نے اپنے کمال سحر کا مظاہرہ کیا ۔ جواباً حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا اعجاز دکھایا ، جادوگروں کی رسیوں کو جو سانپ بن کر دوڑنے لگی تھیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا نے اژدھا بن کر ہڑپ کر لیا ۔ فرعون ، اس کے جملہ اکابر دربار ، اور دیگر حاضرین سب یہ منظر دیکھ رہے تھے ، مگر جادوگر سجدے میں گر پڑے ، اور وہ اس لیے سجدے میں گر پڑے کہ وہی تو فن سحر میں ماہر تھے اور انھی کو تو یہ معلوم تھا کہ سحر کی آخری حد کیا ہے اور اعجاز کہاں سے شروع ہوتا ہے ، یہ بات فرعون نہیں سمجھ سکتا تھا ۔ یہ بات فرعون کے اکابر سلطنت یا مندروں کے پروہت نہیں جان سکتے تھے ۔ نیز یہ بات عام رعیت کے افراد کے فہم سے بھی بالا تھی ۔ ساحروں نے اس اعجاز کو تسلیم کیا مگر فرعون اور اس کے اکابر کے نزدیک اور اسی طرح دوسرے عام افراد کے نزدیک بھی حضرت موسیٰ کا معجزہ برتر کاروبار ساحری تھا اور بس ۔ چنانچہ فرعون نے اپنے ماہرین جادو سے یہی کہا کیا تم ایمان لے آئے اور قبل اس کے کہ میں تمھیں اجازت دوں ، میں تمھیں یہ اور یہ سزا دوں گا ، جادوگروں کا جواب تھا کہ ہم نے اللہ کی واضح نشانیاں پا لی ہیں ۔

''قالو لن نوثرک علیٰ ما جاءنا من البینات والذی فطرنا ناقص ماانت قاض.[۱]

(جادوگر بولے ہم تجھ کو کبھی نہ ترجیح دیں گے ان شواہد کے مقابلے میں جو ہم کو مل چکے ہیں اور اس ہستی کے مقابلے میں جس نے ہمیں پیدا کیا

۱۔ قرآن حکیم سورۃ ۲۰ ، آیت ۷۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لہذا جو فیصلہ تجھے کرنا ہے کر ڈال)

رہا قرآن کریم تو اس کا اعجاز ایک نہیں ۔ ہمیں معلوم نہیں کیا کیا اعجاز اس کے دامن میں مستور ہیں ، قرآن نہ ایک دور کے لیے ہے ، نہ ایک علاقے یا قوم کے لیے ، نہ ایک قسم کے ماہرین کو چیلنج نہ ایک قسم کے علم کو ، تا قیامت اسے ہر کمال سے برتر رہ کر رہبری کرنا ہے ۔ جب یہ نازل ہوا تو اہل عرب کو اپنی زبان فصاحت ترجمان پر بڑا ناز تھا ۔ مسیحیوں کو اپنے علم و بصیرت پر ناز تھا ، یہود کو اپنے عقائد اور صحائف پر گھمنڈ تھا ، مگر قرآن کے سامنے نہ فصحا کی فصاحت ٹھہری اور نہ اہل دلیل کی دلیل نے کام دیا ، اہل فصاحت نے مانا کہ کوئی شے ہے جو ان کے بس کی نہیں ۔ اہل دلیل نے دیکھا کہ قرآنی برہان کے آگے ان کی پیش نہیں چلتی ، پھر جن کو اللہ کے خلوص کی دولت سے نوازا تھا وہ اللہ کی برہان کو مانتے چلے گئے ـــــ عباسیوں کے عہد میں یونانی فلسفے نے مسلمانوں کی نظروں کو چندھیا دیا اور انھوں نے قرآن کی روح سے غافل ہو کر یونانی فلاسفہ کے دلائل کو قرآن پر منطبق کرنا شروع کیا ، بڑی دیر کے بعد جا کر ہوش آیا کہ یونانیت کیا شے ہے اور قرآن کا درس کیا شے ہے ۔ علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں :

"شروع شروع میں تو انھیں (مسلمانوں کو) اس امر کا احساس نہیں ہوا کہ قرآن کی روح فلسفۂ یونان کے منافی ہے اور اس حکمت یونان پر اعتقاد کرتے ہوئے انھوں نے قرآن پاک کا مطالعہ بھی فکر یونان ہی کی روشنی میں کیا ، لیکن قرآن مجید کا زور چونکہ محسوس اور ٹھوس حقائق پر ہے اور حکمت یونان کا حقائق کے بجائے نظریات پر لہذا ظاہر ہے کہ یہ کوششیں ایک نہ ایک دن ضرور ناکام رہتیں ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ، اور یہ اسی کوشش کی ناکامی تھی جس کے بعد اسلامی تہذیب و ثقافت کی حقیقی روح برسر کار آئی ۔ حتی کہ تہذیب جدید کے بعض اہم پہلوؤں کو دیکھیے تو ان کا ظہور بھی اسی (یونان کے خلاف مسلمانوں کی ذہنی بغاوت) کا مرہون منت ہے"[1]

یونانیت کے اس ریلے کے بعد کئی ریلے آئے ۔ آج کے دور میں کہ اس دور کی روح شدید مادہ پرستانہ ہے مادہ پرستی کی تلقین کرنے والے یا مادہ پرستی کے ردعمل میں تفریط کا شکار ہو جانے والے ازم کارفرما ہیں ۔ ہر نظام اور ہر ازم کے مقابل علامہ اقبال کے نزدیک تعلیم و تلقین وہی پائدار ہے جو اسلام کہلاتی ہے اور جس کے مبادیات قرآن میں ہیں ، جس کے عملی نمونے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور ارشادات میں جلوہ گر ہیں :

۱۔ تشکیل جدید ، ص ۱۷۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زمانہ کہنہ بتاں را ہزار بار آراست ! !
من از حرم نگذشتم کہ پختہ بنیاد است

اسلام کی تمام تر تعلیمات کی روح یہ ہے کہ آدم اپنے اس مقام کو پا لے جسے خدا نے اپنی خدمت قرار دیا تھا، قرآن ہر دور میں آدم کی تربیت اور رہنمائی کا ذمہ دار ہے اور ماہر علم کے لیے مستقل چیلنج ۔ یہ دور سائنسی معجزات کا دور ہے اور ہم سطور سابقہ میں بحث کر آئے ہیں کہ قرآن کے اعجاز تک سائنس پہنچنے کی کوشش کر رہی ہے اور کرتی رہے گی، مگر جیسا کہ پہلے عرض ہوا یہ چیلنج آج کے ماہرین علوم کے لیے ہے۔ جو لوگ سائنس کا گہرا مطالعہ کر رہے ہیں اور کارخانۂ فطرت کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں آج قرآن کے نزدیک وہی علماء ہیں اور قرآن کا معجزہ انھی کو متاثر بھی کرے گا ۔ اس دور میں قرآن کریم کے انوار کو روایتی تفاسیر اس شان سے بیان نہیں کر سکتیں جس شان سے جدید ترین اسرار کائنات کو منکشف کرنے والے یا ان انکشافات کا تا تاریخ تازہ و شاداب علم رکھنے والے کر سکتے ہیں ۔ اس دور میں سائنسدانوں کو قرآن پڑھانا چاہیے اور یہی لازمی جہت علمی ہے جو آدم کا زبان معاصر میں اپنے خالق سے رابطہ استوار رکھے اور اس کے اندر ''نفخت فیہ من روحی'' کی شان کا پرتو پیدا کرے ۔

کارخانۂ فطرت کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ بنو آدم کو حکم ہے کہ وہ انسان کے ماضی سے آگاہ رہے تا کہ اپنا حال اور استقبال سنوار سکیں، چنانچہ ایک سے زیادہ بار ''سیروا فی الارض'' کا حکم ہوا —— اے بنو آدم دنیا میں گھومو پھرو، اور دیکھو کہ جو قومیں تم سے قبل یہاں آباد تھیں ان کا انجام کیا ہوا ۔ قرآن نے بتایا ہے کہ ان قوموں کو خدا نے بڑی قوت دی تھی، بڑی فارغ البالی اور خوش حالی عطا کی تھی، ہر نعمت سے نوازا تھا، مگر وہ لوگ غافل ہوگئے، ہوس نے اندھا کر دیا ۔ لہذا انسانی بلندیوں سے اتر کر حیوانی سطح پر پہنچ گئے، نیکی اور بدی کے مابین اپنے غرور گناہ اور سرور ہوس کے باعث تمیز کرنے کے قابل نہ رہے ۔ اللہ کے حکم کی کھلے بندوں مخالفت کی لہذا قانون الٰہی سے ٹکرا گئے، قانون الٰہی توازن بحال رکھتا ہے ۔ جہاں ذرا توازن بگڑا اللہ کا قانون آڑے آ گیا، قرآن کریم نے اچھائی اور برائی کی مثالیں دے دے کر بنی آدم کو عبرت اندوزی پر آمادہ کیا، آثار ماضی صحیفۂ زمین پر نقوش عبرت ہیں، تاریخ انسانی کمال و زوال کی داستان ہے قرآن کا ارشاد ہے :

''افلم یسیروا فی الارض فتکون لھم قلوب یعقلون بھا و آذان یسمعون بھا فانھا لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور''[۱]

۱۔ قرآن حکیم سورۃ ۲۲ آیت ۴۶ ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس آیۂ کریمہ میں کفار و مشرکین مکہ کی طرف اشارہ ہے جن کے تجارتی قوافل یمن میں پائے جانے والے آثار عاد و ثمود کو دیکھتے تھے اور شمال میں روم کی بستیوں کے کھنڈرات کا نظارہ کرتے تھے ، مگر انھیں عبرت نہ ہوتی تھی ؛ اس لیے کہ ان کی آنکھیں تو تھیں مگر بینا نہ تھیں اور ان کی یہ ''تنگیٔ چشم'' ''کثرت نظارہ سے بھی وا نہ ہوتی تھی''۔ آیت کا معنیٰ ہے '' کیا یہ لوگ فرش زمیں پر چلتے پھرتے نہیں ؟ پھر انھیں وہ دل میسر آ جانے چاہییں تھے جن کی مدد سے یہ سوچ سکتے ، وہ کان میسر آ جانے چاہییں تھے جن کی مدد سے یہ سن سکتے ، اصل بات تو یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہو جاتیں وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں کے اندر ہیں ۔''

تاریخ ماضی اور آثار قدیمہ نے یہی درس دیا کہ معاشرے خدائی ہدایت پر مبنی اصولوں کی بدولت باقی رہتے ہیں ۔ جہاں فطری اصولوں یعنی خدا کی عطا کردہ فطرت صالحہ کے تقاضوں کی خلاف ورزی کرکے آدم نے اپنی مرضی کو اختیار کیا وہیں نقصان سے دوچار ہوا اس لیے کہ ہدایت خداوندی سے محروم فکر و نظر کا انتخاب درست اور صحیح ہوتا ہی نہیں ۔ لہذا کوئی انسانی نظام پائدار نہیں ۔ پھر کوئی انسان کا وضع کردہ نظام ایسا نہیں جو مختلف معاشروں کے لیے یکساں قبول ہو ۔ جارج فرائڈ مین لکھتا ہے :

The orthodox natural law theory based its absolutes on the revealed truths of religion. If we attempt to Secularize jurieprudence, where can we find an agreed basis of values.''[1]

اب رہا بنو آدم کے افراد کا مطالعۂ ذات تو ظاہر ہے کہ ہر فرد بشر ایک انوکھا مظہر ہے ، وہ دنیا میں اکیلا آتا ہے ، اکیلا چلا جاتا ہے ۔ وہ اپنے خالق کے حضور میں اپنے اعمال کی جزا و سزا پانے کے لیے بھی اکیلا ہی پہنچتا ہے ۔ کوئی شخص عوضاً نہیں پیدا ہوتا ، کوئی شخص عوضاً نہیں مرتا ، حیات اپنی اپنی ، ممات اپنی اپنی ، اسی طرح جواب دہی بھی اپنی اپنی ، ہاں جواب دہی بقدر شعور ، جو جتنا صاحب علم و شعور ہے تو اتنا ہی زیادہ ذمہ دار ہے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے :

''ویل للجاھل مرۃ و للعالم سبع مرات''

۱- Legal Theory : London (1967) ص ۱۲٦

مگر قرآنی نظریۂ تاریخ اور علامہ اقبال کے موضوع پر ہم ایک مبسوط مقالہ پہلے قلمبند کر چکے ہیں اور وہ نقوش کے اقبال نمبر (جلد دوم) میں شامل ہے لہذا یہاں ہم اس موضوع کی تفصیلات میں نہیں جاتے ۔

۲- الفتح الربانی ، ص ۹۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا فرد بشر اپنی تکمیل پر قادر ہے ؟ کیا وہ بشری غایت کو پا لیتا ہے ؟ کیا وہ حقیقی معنوں میں آدمی بن جاتا ہے---حق یہ ہے کہ اولاد آدم کے سوا تمام مخلوقات عالم اپنی اپنی غایت کو قانون فطرت کے تحت خود بخود پا لیتی ہیں ۔ ایک بیج اگتا ہے ، پورا درخت بنتا ہے ، پھولتا ہے ، پھلتا ہے ، پھر نئے تولیدی بیج دے کر اپنا چکر پورا کر دیتا ہے ۔ یہی حال حیوانوں کا ہے ۔ وہ بھی اپنی نوع کی غایت تک پہنچ جاتے ہیں ، فطرت پہنچا دیتی ہے ۔ لیکن پودے زمیں گیر ہیں ۔ یہی حال حیوانات کا ہے مگر بہرحال وہ حرکت پر قادر ہیں سب کا وجود مادی حدود کے اندر محدود ہے ، ان کی معروف معنوں میں نفسی زندگی نہیں ، ان کی اپنی مرضی ، ان کا اپنا انتخاب ، ان کا اپنا پروگرام ان کی زندگی کے مراحل میں کہیں داخل نہیں ہوتا ، وہ فقط آئین فطرت کے تابع ہیں ۔ حیوانوں کو اللہ تعالی نے مخصوص جبلتیں دی ہیں ۔ وہ حیوانوں کو چلاتے اور جلانے رکھتی ہیں ۔ نباتات بھی مسئولیت سے آزاد اور حیوانات بھی ، نہ اختیار نہ جواب دہی ، مگر بنو آدم کا مسئلہ بالکل جدا ہے ۔

آدمی پیدائش سے موت تک ایک ہی سطح پر نہیں رہتا ۔ اس کی ایک سطح حیوانی ہے ، وہاں وہ جبلتوں کے تابع ہے ۔ پھر ذرا بیدار ہوتا ہے تو عقل کی مداخلت اور رہبری شروع ہو جاتی ہے پھر اس کو عقائد اور افکار کی دولت نصیب ہونے لگتی ہے ۔ ہوتے ہوتے ، اگر ٹھیک تربیت میسر آ جائے ، تو وہ ایمان محکم اور وجدان کی نعمت سے بھی بہرہ یاب ہونے لگتا ہے ۔ گویا آدمی میں عزم ، حزم ، فکر ، نظر ، حریت ، مسرت ، پسند ، ناپسند ، ظلم ، مہربانی ، خود غرضی ، ایثار اور نہ جانے کیا کیا جوہر نمودار ہوتے ہیں ، وہ اوپر کو چلا جائے تو اعلائے علیین تک پہنچے اور نیچے کو لڑھکے تو اسفل السافلین تک گرے ، اس کی بلندی بعد از خدا بلند ترین اور اس کی پستی ہر پست سے پست تر ، مفکر لے کامتے دلونوئے اپنی کتاب Human Destiny کا خاتمہ ان سطور پر کرتا ہے :

''سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسے (آدم کو) یاد رہنا چاہیے کہ نور خداوندی کی چنگاری اس میں اور فقط اسی میں ہے ، وہ چاہے تو اسے پرے رکھ دے اور چاہے تو (قانون) خدا کے مطابق اور خدا کی خاطر پوری رغبت سے عمل پیرا ہو کر قرب خداوندی حاصل کر لے ۔''

آدمی اپنے مکانی پہلو کی رو سے مادی وجود ہے ، ایک مشت خاک ، لیکن یہ تو آغاز ہے ، انتہا تو نہیں ، علامہ اقبال فرماتے ہیں :

''رہی یہ بات کہ اعلیٰ کا صدور ادنیٰ سے ہوتا ہے سو اس سے اعلیٰ کی قدر و قیمت اور مرتبے میں کوئی فرق نہیں آتا کیونکہ اہم بات یہ نہیں کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کسی چیز کی ابتدا کیونکر ہوئی اہم بات یہ ہے کہ جس چیز کا صدور ہوا اس کی صلاحیتیں کیا ہیں ، معنیٰ اور مطلب کیا ہے ، اس کی انتہا کیا ہے یعنی اس کی رسائی کہاں تک ہے ۔“۱

مادی اعتبار سے آدمی مادی تقاضوں کے تابع ہے ، یہ وہ سطح ہے جہاں بے زمام جبلتیں فرمانروائی کرتی ہیں ، جبلتوں میں اساساً کوئی خرابی نہیں ۔ خرابی ان کے بے لگام ہونے میں ہے ۔ ہر قوت جس سے کام لینا ہو اسے پابند آئین کرنا ضروری ہے ، ظاہر ہے کہ تابع ضبط ہونے کا معنی مٹ جانا نہیں ۔ ہر جبلت آدمی کی جوہری قوت کا مظہر ہے مگر تناسب و توافق کے بغیر وہ جبلت وحشی رہتی ہے ۔ سدھائے ہوئے منہ زور گھوڑے مفید اور کارآمد ہیں اور اگر وہ سدھائے ہوئے نہ ہوں ، پابند لجام بھی نہ ہوں تو محض وحشی لہذا ناکارہ ۔ تاہم یہ بات واضح ہے کہ جبلت سے تعقل تک بڑی طویل مسافت ہے اور پھر تعقل کا وجدان بیدار سے ربط پیدا ہوتے بڑا وقت لگتا ہے ، آدم کی جبلت قوت ناطقہ و عاقلہ کے تابع ہو اور پھر ایمان و ایقان کی رہبری میسر ہو تو جب جا کر انسان انسان بننے لگتا ہے ، یہ وہ اندرونی امکانات ہیں جن سے حیوانات سر تا سر محروم ہیں ، اس باب میں حضرت علامہ کہتے ہیں :

”یوں بھی ارتقائے حیات پر نظر رکھی جائے تو یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ شروع شروع میں اگرچہ طبعی کا نفسی پر غلبہ ہوتا ہے لیکن پھر جیسے جیسے نفسی طاقت حاصل کرتا ہے طبعی پر چھا جاتا ہے اور اس لیے عین ممکن ہے کہ آخرالامر اس سے بالکل آزاد ہو جائے ۔“۲

جب آدمی اس مسئلے سے آگاہ ہوتا ہے کہ اس کی ترجیحات کیا ہیں ؛ یعنی اسے کس امر کو کس امر پر ترجیح دینا ہے ، تو یہ آگاہی شخصی وحدت کی سمت میں نقطۂ آغاز کی حیثیت رکھتی ہے ۔ شخصیت یا ذات کو ارتقا یاب ہو کر آخر حصول وحدت پر قادر ہونا ہے ۔ اگر کوئی شخص وحدت سے محروم ہے تو گویا وہ انفرادی ذات اور وجود سے محروم ہے ۔ وہ بظاہر موجود ہے مگر حقیقتاً نابود ہے ، شخصیت اپنے تشخص کے باعث شخصیت ہوتی ہے ۔ جہاں ایک شخص میں کئی شخصتیں ہوں ، وہ گویا اپنی خودی تک رسائی حاصل نہ کر سکا ۔ وہ ”بے خود“ شخص ہے ۔ وہ شخص اب یہ ہے ۔ جب وہ ہے ، پھر نہ یہ نہ وہ ، ایسا فرد نا فرد ہے ، فرد وہ ہے جو ”واحد الوجود“ ہے ۔

۱۔ تشکیل جدید ص ۱۶۰ ۔

۲۔ تشکیل جدید ص ۱۶۱ ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مگر انسانی ہستی کو وحدت اور اکائی بنانے کے باب میں صرف علوم کتابی و نصابی کافی نہیں ۔ کوئی شخص بیشک ماہر فقیہہ ہو ، انجینئر ہو ، بڑا فائق صناع ہو ، مقبول و معروف طبیب ہو ، پختہ کار شاعر ہو ، صاحب تجربہ معلم ہو ، کہنہ مشق جج ہو ، لیکن یہ سب حیثیتیں علم و مہارت کی نسبتیں ہیں اور حوالے ، آیا کوئی انجینئر ، معلم ، جج ، صناع ، شاعر وغیرہ از روئے شخصیت خود اپنی ذات میں ایک ''اکائی'' ہے کیا وہ وحدت کا مالک ہے ۔ کیا وہ فرد ہے ، یا جہاں اقرار کا معاملہ آئے وہاں یہ بھی ہے اور وہ بھی ، مگر جہاں کردار کی منزل آئے وہاں نہ یہ نہ وہ ، لہذا وہ وجود بحیثیت فرد آدم کچھ بھی نہیں ۔ فکر و نظر ہم آہنگ نہ ہوں اور نظریہ و عمل میں مطابقت نہ ہو تو آدمی خواہ کسی بھی کمال کا مالک ہو ایک معتبر خوش پوش ، خوش وضع ، خوش گفتار دوپایہ ہے اس لیے کہ جس ذات میں افکار و نظریات کا انتشار ہو اور روح پر مادی تقاضے غالب ہوں ، وہ ذات ابھر ہی نہیں سکتی ، بقول حضرت علامہ :

حیات کیا ہے خیال و نظر کی مجذوبی !!
خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناگون

آدمی کے ننھے سے وجود میں پوری کائنات کے سارے بنیادی عناصر کارفرما ہیں ۔ اسی لیے ہر فرد اپنی ذات میں ایک جہان صغیر (Microcasm) قرار پاتا ہے ۔ اس امر کا یہ حتمی تقاضا ہے کہ اس میں نور خداوندی کا بھی کوئی ذرہ موجود ہو ۔ اس لیے کہ ہر زمین و آسمان کا نور اللہ کی ذات ہے اور آدم میں خدائی صفات کا پرتو بالقوہ موجود ہے یعنی اس کے اندر وہ جوہر مخفی ہیں جو بروئے کار آنے کے منتظر رہتے ہیں ۔ ان مضمر امکانات کا بروئے کار لانا ہی درحقیقت فرد آدم کا اپنی ذات کی تکمیل کرنا ہے یا خودی تک رسائی حاصل کرنا ہے اور جب وہ اپنی خودی تک رسائی حاصل کر لیتا ہے تو پھر اس کا مقام فرشتوں سے بلند تر ہوتا ہے ۔ اس لیے کہ نفخ روح (اللہ کا آدم کے پتلے میں اپنی روح پھونکنا) ایک بیدار حقیقت بن جاتی ہے ۔ ایسے عالم میں فرد آدم ''واحد الوجود'' یعنی ایک مستحکم اکائی بن چکا ہوتا ہے اس کو مادی تقاضے مغلوب نہیں کر سکتے ، الٹا وہ حکم خداوندی کی روشنی میں ہر مادی اور جبلی تقاضے کو مسلمان کر چکا ہوتا ہے ۔

نباتی ، حیوانی او. جبلی سطح سے بڑھتے بڑھتے صحیح معنوں میں نائب خدا بن جانا ہی سفر نامہ خودی ہے ، عمل حیات ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ایک خدا پر ایمان محکم و پائدار میسر نہ ہو ۔ حضرت علامہ نے دو مصرعوں میں اس حقیقت کو کس شان سے بیان کیا ہے ، یعنی خود آگاہی کا مطلب ہے کہ آدمی غلام وجود نہ ہو ، وہ فقط احکام الٰہی کا تابع ہو :

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خودی سے اس طلسم رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید ہے جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

ہر مطلوب اپنے طالب پر اثر انداز ہوتا ہے ، ہر مقصود اپنے قاصد پر اپنا پرتو ڈالتا ہے ، حیوان کے پجاری میں حیوانی خصلت آنی چاہیے ، پتھر کے عبادت گذار میں محبت کو در آنا چاہیے ، مشین کے بندے میں مشینی اوصاف رونما ہونے چاہییں ، ـــــاس اعتبار سے بتوں کے پجاری اشخاص کا تصور کریں ، وہ محض ایک بت کو تو نہیں پوج سکتا ۔ کوئی ایک بت سارے اوصاف اور ساری قوتوں کا مالک نہیں ہو سکتا ، ہاں بہت سے بتوں کے مقابل ایک بت کو بڑا قرار دیا جا سکتا ہے ۔ فقط ایک بت سے کام نہیں چلتا ۔ اگر ایک بت کفایت کرتا تو ایک ذات خداوندی کو کیوں نہ اپنا لیا جاتا ؟ اب ہر بت کے اپنے اوصاف ہیں ، پجاریوں کی شخصیت پر کوئی ایک بھرپور پرتو نہیں پڑتا ، نتیجہ یہ کہ مشرکوں میں شخصی وحدت کا تصور ناممکن ہے ، مسلمان کہلانے والا اگر شخصی وحدت سے محروم ہے تو یہ اس کے ایمان کی کمزوری ہے ، وہ وحدت کے حصول پر قادر ہے اس کے یہاں امکانات موجود ہیں ۔ اس کا عقیدۂ توحید الٰہی اس امر کی مضبوط ترین ضمانت ہے ، مگر بت پرست میں تو ایسا کوئی امکان ہی نہیں ۔ اس کی کوئی شعوری کوشش مدد نہیں دے سکتی ، اس لیے کہ اس کے شعور کی ساخت ہی مشرکانہ ہے ۔ A. M. Hocart کا قول ہے :

''جیسا دیوتا ویسے ہی اس کے حضور میں بھینٹ چڑھانے والے ، اس لیے کہ پجاری اپنے دیوتا کے نمائندے ہوتے ہیں ، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے دیوتا کس کس طرح کامیاب ہوئے ۔''[۱]

اسی آہنگ کے ساتھ یہی مصنف اس حقیقت کی مزید وضاحت کرتا ہے :

''(یونان میں) بنیادی نظریہ وہی ہے جو ہندوستان میں ہے ، جو زندہ ہیں ان کا رویہ آنجہانیوں جیسا ہے ۔ دیوتاؤں نے ایک دوسرے کو دھوکا دیا ، ایک دوسرے پر زیادتی کی ۔ اب ان کے جانشینوں کا بھی فرض ہے کہ وہی کچھ کریں ، یہ رویہ زندگی کے ساتھ جس قدر مربوط ہندوستان میں ہے اس قدر کسی دوسرے ملک میں نہیں ۔''

اور واضح ہے کہ پوری کائنات میں کوئی معاشرہ جو بظاہر تمدن کے دریائے راوی سے فیضیاب ہونے کے باوصف نفسیاتی طور پر پانچ ہزار سال کی بت پرستی پر قائم ہو اس معاشرے میں بتوں کی تفرقہ انگیزی کا اثر کتنا نمایاں ہوگا ۔ ایسے

۱۔ Life Giving Myth ، ص ۲۱۱ ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معاشرے میں آدمی خود اپنی ذات میں بھی سب سے زیادہ منقسم رہے گا اور سوسائٹی کو بھی ایک نہ ہونے دے گا۔ برھمن، کھشتری، ویش اور شودر والا معاشرہ اور ہریجنوں اور اچھوتوں والی سوسائٹی پوری دنیا میں کہیں نہیں، (قدیم وحشی قبائل اگر کہیں ہیں تو وہ اس ضمن میں نہیں آتے) لہذا ہندو معاشرے میں جو کائنات میں واحد اور حقیقی مشرک معاشرہ ہے کسی شخصیت کا پیدا ہونا جو واقعی وحدت کی مالک ہو ممکن ہی نہیں۔ ہندو سوسائٹی کا بڑے سے بڑا آدمی بھی زیادہ سے زیادہ مسٹر موہن داس کرم چند گاندھی ہو سکتا ہے۔

آدمی بھول جاتا ہے کہ کائنات ایک وحدت ہے۔ وحدت اس لیے ہے کہ اس کا خالق ایک ہے اور اس خالق کی قدرت کاملہ کی بدولت ہر شے آپس میں دور و نزدیک سے مربوط ہے"[۲] — یہ وہ تعلیم و تلقین ہے جس پر قرآن نے زور دیا ہے، اگر خدا ایک نہ ہوتا تو کائنات بھی ایک نہ ہوتی۔ ہر خدا کی اپنی اپنی حدود خدائی ہوتیں، اور پھر وہ اپنی اپنی حدود میں رہتے کیوں؟ — نہ ایک فطرت اشیا ہوتی، نہ ایک ضابطہ، کیا ایسے میں دنیا باقی رہ سکتی تھی؟ خدائے تعالیٰ نے اسی لیے تو ارشاد فرمایا ہے:

"و کان فیھما آلھتہ الا اللہ لفسدتا"[۳]

(اگر ان دونوں (زمین و آسمان) میں خدا کے علاوہ کوئی اور معبود بھی ہوتا تو یہ دونوں درہم برہم ہو چکے ہوتے)

سیدھی سی بات ہے کہ توحید الٰہی کائنات کی وحدت اور کائنات کی وحدت توحید الٰہی پر دال ہے۔

اس کارخانۂ قدرت میں جہاں فطرۃ اللہ واحد ہے انسان کا انسانیت کی سمت رخ اور ارتقا درحقیقت خدائے واحد کی جانب سفر ہوتا ہے۔ حضرت علامہ کا ساقی نامہ اسی سفر کی داستان ہے:

وہی سجدہ ہے لائق اہتمام — کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پہ حرام!!
یہ عالم یہ ھنگامۂ رنگ و صوت — یہ عالم کہ ہے زیر فرمان موت!
یہ عالم یہ بتخانۂ چشم و گوش — جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش
خودی کی ہے یہ منزل اولیں — مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں!
تری آگ اس خاکداں سے نہیں — جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں

۱۔ ایضاً، ص ۲۱۱۔

۲۔ Islamic Idealogy، از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ص ۱۵۲۔

۳۔ قرآن حکیم سورہ ۲۱ آیۃ ۲۲۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بڑھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر! طلسم زمان و مکاں توڑ کر!
خودی شیر مولا جہاں اس کا صید زمیں اس کی صید آسماں اس کا صید
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود! کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود!
ہر اک منتظر تری یلغار کا! تری شوخیٔ فکر و کردار کا
یہ ہے مقصد گردش روزگار کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار!
تو ہے فاتح عالم خوب و زشت! تجھے کیا بتاؤں تری سرنوشت
حقیقت پہ ہے جامۂ حرف تنگ حقیقت ہے آئینہ گفتار زنگ
فروزاں ہے سینے میں شمع نفس مگر تاب گفتار کہتی ہے بس!

"اگر یک سر موئے برتر پرم!
فروغ تجلی بسوزد پرم"

جو فرد گوشت پوست کی اپنی دنیائے صغیر (Microcasm) کو مسخر کر لیتا ہے اس میں اگلی تسخیر کی اہلیت یعنی دنیائے کبیر (Macrocasm) کو مسخر کرنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے اور یہی وہ کیفیت ہے جسے حضرت علامہ نے شعر ذیل میں پورے فنکارانہ و مجذوبانہ لب و لہجہ میں بیان کیا ہے:

چیست دین برخاستن از روئے خاک!
تا ز خود آگاہ گردد جان پاک!

مطلب واضح ہے کہ آدمی کا خدا کے رخ سفر اس کا توحیدی عمل ہے اور خود آگاہی کی تدریج بھی۔ آدمی جتنا مادی کائنات سے اونچا اڑتا ہے اتنی ہی اس میں وحدت جلوہ گر ہوتی ہے وہ تخلقوا باخلاق اللہ (الٰہی اوصاف اپنے اندر پیدا کرو) کے باعث "واحد الوجود" ہوتا چلا جاتا ہے، اور پھر جس کو فطرت الٰہی کے ساتھ مزاجی ہم آہنگی میسر آ گئی وہ خدا مست فاتح عالم ٹھہرا۔ George Kelsay وضاحت کرتا ہے کہ

"آدمی صحیح معنوں میں آدمی اسی وقت بنتا ہے جب وہ حکم خداوندی کے سامنے بکمال رغبت و شروع سر تسلیم خم کرتا ہے۔ اس کی تخلیق ہی اس طرح ہوتی ہے کہ وہ خدا کے بغیر زندگی سے بہرہ ور ہو ہی نہیں سکتا، ایک آزاد وجود کا مالک فقط وہی فرد کہلا سکتا ہے جو زندگی کی ہر تفصیل میں آزادانہ مرضی کے ساتھ حکم خداوندی کے تابع ہو۔"[1]

خدا پرست بزرگان خدا میں سے سب سے واضح مثال پیغمبران الٰہی کی ہے جنھوں نے اپنی زندگی کے باریک سے باریک امر میں مرضیٔ مولا کی شمع ہدایت کو

۱۔ Racism and the Christian understanding of Man ص ۷۶۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پیش نظر رکھا ۔ ہر پیغمبر خدا اپنے معاشرے کا فائق ترین انسان تھا اور اس کی شخصی ہم آہنگی اور وحدت اور اس کا استقلال لازوال ذات واحد کی ترجمان تھی ۔ تمام پیغمبروں کی بنیادی تعلیم ایک تھی پیغمبران خدا بنو آدم کے حق میں ، ان کی خود یابی کے مسئلے اور معاملے میں اللہ کی سب سے بڑی نعمت تھے ، اگر بنو آدم کو خود انہی کی دانش پر چھوڑ دیا جاتا تو وہ اقدار کے شعور سے کیونکر اور کب تک بہرہ ور ہوتے ۔ خیر و شر ، کذب و صدق ، ظلم و انصاف ، حرص و ایثار ، غرور و انکسار ، وغیرہ اقدار ، اذہان و قلوب میں کون راسخ کرتا ، اور پھر تعمیر آدم کیوں کر عمل میں آتی ۔ اسی لیے تو قرآن کریم میں خدائے تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

”یمنون علیک ان اسلموا قل لاتمنوا علی اسلامکم بل اللہ یمن علیکم ان ھدا کم للایمان ان کنتم صادقین“[1]

(یہ لوگ آپ پر احسان رکھتے ہیں کہ وہ اسلام لائے ، آپ کہہ دیجیے کہ مجھ پر اپنے اسلام لانے کا احسان نہ رکھو ، الٹا یہ تو اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی راہ پر لگایا ۔ بشرطیکہ تم (دعوائے اسلام میں) سچے ہو ۔)

بنو آدم کائنات کی ہر شے سے مختلف اور برتر امکانات کے مالک ہیں ۔ لہذا ان کی تربیت اور تکمیل کے وسائل بھی دوسری مخلوقات سے مختلف درکار ہیں، ان کی فقط بدنی ہی نہیں روحانی پرورش بھی کرنا ہوتی ہے؛ اور پھر یہ کہ بدنی پرورش میں بھی حلال و حرام اور لقمہٗ حرام کے اثرات اپنے نتائج پیدا کرتے ہیں ، اگر روح بدن سے کوئی الگ شے ہوتی تو بدن کو پاک اور حلال اشیاء سے جو بطریق جائز حاصل ہوتی ہوں پالنا کیوں ضروری ہوتا ۔

حضرت ابوالنجیب ضیاء الدین سہروردی جن کا نام عبداللہ بن قاہر تھا اور جو حضرت شہاب الدین سہروردی کے چچا تھے ، لکھتے ہیں کہ جس شخص کے وجود میں لقمہٗ حرام شامل ہو جائے وہ طاغوتی آواز اور الہام میں تمیز کرنے کے قابل ہی نہیں رہتا ۔[2]

چنانچہ حرام خور اور بدنیت قوم اقدار و معیار کے شعور سے محروم ہو جاتی ہے ۔ وہ ابلیسوں کو اپنا ہادی اور مقتدیٰ بنا لیتی ہے ۔

آدمی خود اپنا خالق نہیں لہذا وہ اپنی حقیقی حیثیت اور قدر و قیمت کو نہیں جان سکتا ۔ وہ اپنے بنائے ہوئے معلموں کے ذریعے بھی اپنی حقیقت سے آگاہ نہیں

۱۔ قرآن حکیم سورہ ۴۹ ، آیۃ ۱۷ ۔

۲۔ عوارف المعارف ، دارالکتاب العربی ، بیروت ، ص ۴۶۴ ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو سکتا ۔ وہ خالی جسم نہیں وہ روح بھی ہے ۔ دونوں کا ملاپ اتنا گریز پا ہے کہ کسی مشین کے بس کا روگ نہیں ۔ ہاں کوئی روحانی طور پر فائق تر شخص کسی فرو تر شخص پر ایک حد تک حاوی ہو سکتا ہے اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

''اتقوا فراستہ المومن فانہ' یری بنور اللہ :''۱

(مومن کی فراست سے ڈرو اور خبردار رہو اس لیے کہ وہ نور خداوندی کی مدد سے دیکھتا ہے)

اور یہی اہل ایمان ہیں جن کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''جواسیس القلوب'' قرار دیا تھا مگر وہ فائق افراد وہی ہیں جن کے وجود میں حاکمیت اور بالا دستی روح کی ہے ، جن کے وجود میں بدن روح کے احکام کی یکسر تعمیل کرتا ہے ۔ بندگان خدا دوسروں پر ، بالغ تر وجدان کے باعث یا دل بیدار تر کے سبب سے حاوی ہو جاتے ہیں ۔ یہ حالت پیغمبروں ہی کے بتائے ہوئے طریق عمل کی بدولت حاصل ہو سکتی ہے ۔ خدا مست ہونے کے باب میں کوئی انسان پیغمبروں کا ہمدرجہ نہیں ہو سکتا ۔ ہمارا عقیدہ ہے اور وہ ہمارے پختہ ایمان پر استوار ہے کہ اللہ کی تعلیمات اور رہبری قرآن کی صورت میں تکمیل کو پہنچی ۔ قرآن تمام کتب سماوی کی روح کی نمائندگی کرتا ہے اور تکمیل بھی ، اسی طرح حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں آپ سے پہلے آنے والے جملہ پیغمبروں کی سیرت تکمیل یاب ہوئی ۔ حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ رسالت کی تکمیل ہی سلسلہ' رسالت کے اختتام کی دلیل ہے ۔

حضور نبی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے روپ میں کامل ترین عملی ضابطہ اور قرآن کریم کی صورت میں کامل ترین تحریری آئین حیات بنو آدم کو میسر آ گیا ، چنانچہ خداوند کریم نے قرآن میں اعلان کر دیا کہ ''اب راہ ہدایت بھی واضح ہے اور گمراہی بھی عیاں ہے ۔ کسی پر جبر نہیں ، جو چاہے راہ ہدایت چن لے اور جو چاہے گمراہی اختیار کر لے ۔''۲

ختم نبوت حضرت علامہ کے نزدیک تمام بنو آدم کی وحدت کے لیے ضروری تھی ، اگر خدا مرکز کون و مکان ہے اور وہی ایک مرکز ہے تو اسی طرح حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عالم انسانیت کا واحد مرکز ہیں ، انسانیت کو وحدت سے ہمکنار کرنے کی خاطر کسی ایک سیرت کو چراغ ہدایت ماننا ہوگا ۔ ایک

۱۔ الفتح الربانی ص ، ۱۰ ۔
۲۔ قرآن کریم سورہ ، ۲ ، آیہ ۲۵۶ ۔

© rasailojaraid.com